# بچوں کی شاعری اور اسمٰعیل میرٹھی کی شعری جہات

**پروفیسر علی احمد فاطمی**

شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد (یوپی)

میں اپنے مضمون کا آغاز ایک سوال سے کرنا چاہتا ہوں۔

کیا اسمٰعیل میرٹھی صرف بچوں کے شاعر ہیں؟ غالباً نہیں، لیکن ان کی شاعری کے بڑے حصہ اور مشہور حصّہ کا تعلق بچوں کی شاعری سے ضرور ہے اور وہ اسی طور پر زیادہ مشہور بھی ہوئے۔ وہ مشہور تو ہوئے، لیکن ادب میں مقبول نہیں ہوئے اس لیے کہ ہماری معیار پرست شاعری نے بچوں کی شاعری کو وہ قبولیت کا مقام و درجہ نہیں دیا جس کی کہ وہ مستحق ہے اسی لیے ضروری ہے کہ پہلے کچھ باتیں بچوں کی شاعری کی شعریات اور جمالیات پر کر لی جائیں اس کے بعد اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری پر گفتگو ہو۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے، نقادوں و عالموں نے ادب کی جو بوطیقا بنائی اس کا تعلق شاعری سے تو رہا، لیکن شاعری میں بھی غزلیہ شاعری اور عشقیہ شاعری پیش نظر رہی، اسی لیے مُدتوں ہم میر، مومن، درد غالب وغیرہ کی غزلیہ شاعری پر سر دھنتے رہے اور نظیر، انیس، اکبر وغیرہ پر دھیان نہیں دے سکے جبکہ یہ سب بھی منفرد اور بڑے شاعر ہیں۔ نظیر اکبرآبادی پر مضمون لکھتے ہوئے احتشام حسین نے بلیغ بات کہی۔

''اردو تہذیب کی اس معیار پرستی سے جہاں کچھ فائدے ہوئے ہیں اچھے خاصے نقصانات بھی ہوئے ہیں۔''

ملاحظہ کیجئے جب ہم مُدّتوں نظیر، انیس، اکبر، جوش وغیرہ کو قابل ذکر نہیں گردانا تو ایسے میں بچوں کی شاعری یا بچوں کے ادب کو کیا نام اور مقام دے پاتے۔ اسے تو ہم نے بچکانہ شاعری ہی سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں کسی بڑے ناقد یا اسکالر کی کوئی کتاب بچوں کے ادب سے متعلق نہیں ملتی جبکہ فطری انداز سے ابتدا سے ہی بچوں کے لیے شاعری ہوتی رہی۔ کہانیاں، لوریاں لکھی جاتی رہیں۔ ان میں معیار بھی ہے اور مقدار بھی، نہیں ہے تو اس پر کوئی بڑی تنقیدی و تحقیقی کتاب۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اول تو اس صنف یا موضوع پر توجہ ہی کم دی گئی اور جو تھوڑی بہت جانچ پرکھ ہوئی تو وہ قائم شدہ اکلوتی شعریات کے سیاق میں، اس لیے خلط مبحث ہوتا رہا اور غلط و نامناسب نتائج قائم ہوتے رہے، لیکن آفرین ہے ان فنکاروں پر جو ان جا و بیجا مباحث سے بے نیاز ہو کر بچوں کے لیے شاعری کرتے رہے۔ کہانیاں، ڈرامے لکھتے رہے اور قوم کے نونہالوں کو باتوں باتوں، کہانیوں اور کہاوتوں میں نرم و نازک، لیکن بیش قیمت تعلیم و تربیت دے کر ایک بڑا انسانی و اخلاقی فریضہ انجام دیتے رہے۔ خواہ وہ ادبی فریضہ انجام ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن یہ کون طے کرے گا۔ شاعری کی تنقید؟ یا آج کی تنقید جس کے بارے میں حسن عسکری نے اچھی بات کہی ہے۔ ''آج کی تنقید ادب کی تنقید نہیں ہے یہ تنقید کی تنقید ہے۔''

سب جانتے ہیں کہ بچوں کے ادب اور بالغوں کے ادب میں فرق ہوا کرتا ہے اس لیے کہ بچہ کا ذہن معصوم، سادہ اور ناتجربہ کار ہوتا ہے۔ معصوم، پاکیزہ نفسیات جس میں بے نام تجدّد و تجسس کا مادہ کارفرما ہوتا ہے۔ اس کے تجسس آمیز اور سوال انگیز ذہن و نظر کو دیکھتے ہوئے دادی، نانی وغیرہ ایسے قصے، کہانیاں لوریاں وغیرہ سُناتی ہیں جس میں اس کی دلچسپی۔ انہماک و اشتیاق پیدا ہوتا ہے، لیکن ساتھ ہی ایک درس و درک بھی۔ خیر و شر، نیکی بدی، اخلاق و محبت کا غیر محسوس، غیر معلوم سبق اور درس، بس یہ نزاکت، معصومیت اور غیر محسوسیت ہی بچوں کے ادب کی اساس ہے جو اس کی نازک و نرم نفسیات کے تاروں کو مرتعش کرتی ہے اور یہ ارتعاش بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ مزید اشتیاق و اضطراب میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ وہ بہت کچھ جاننا چاہتا ہے۔ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی سوالیہ حیّات کے ساتھ اس کے جسم کے متوازی اس کے ذہن کی نشو و نما ہوتی ہے اور ذہن گھر سے باہر نکل کر باہر کی دنیا کو دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ پیٹر سنیڈ فورڈ نے لکھا ہے:

"The child becomes interested in outar world and wants to hear other people and other lands."

ایسے میں اگر اس کے آس پاس اسی مزاج و مذاق کے اعتبار سے اچھی کہانیوں کی کتاب، اچھی شاعری، ڈرامے وغیرہ پڑھنے کو ملیں تو یہ ساری چیزیں اس کے متجسس ذہن کو راہ دکھاتی ہیں۔ اچھے اور برے، غلط و صحیح کی تمیز کرواتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑی بڑی باتیں میں آنے لگتی

ہیں۔کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔اگر صحیح تعلیم وتربیت اور ماحول نہ ہوتو بچہ کو بھٹکنے میں دیر نہیں لگتی۔ساحرلدھیانوی نے ایک نظم میں کہا تھا:

انسان جب تک بچہ ہے تب تک سمجھو سچا ہے
جوں جوں اس کی عمر بڑھے من میں جھوٹ کا میل چڑھے
کرودھ بڑھے، نفرت گھیرے ،لالچ کی عادت گھیرے
بچپن ان پاپوں سے ہٹ کر اپنی عمر گزارے، بچے من کے سچے

بچوں کا عمدہ ادب۔شاعری اس موڑ پر،اسی راہ پر عظیم کارنامے انجام دیتا ہے۔ذہن کی تعمیر وتشکیل کرتا ہے۔غلط وصحیح کی تمیز۔جھوٹ وسچ کا شعور پیدا کرتا ہے۔ایک بالغ ذہن کے لیے ادب تخلیق کرنا مشکل کام تو ہے، لیکن ایک نابالغ ذہن کے لیے فصیح اور پُر تاثیر، بامعنی اور بامقصد ادب لکھنا اس سے بھی زیادہ مشکل اور بڑا کام ہوا کرتا ہے۔اس نوع کی شاعری میں فصاحت،سادگی اور تاثیریت کے ناگریز عناصر اس لیے اہم ہیں کہ بچوں کی کم عمری اور معصومیت،سادگی کے پیش نظر بچوں کی شاعری میں زبان اور سادگیٔ زبان کی بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے۔دلکش اور پُرکشش انداز بیان اور ساتھ میں جاذب نظر تصویریں ہوں تو کیا خوب یہ سب کے سب بچوں کو بیحد متاثر اور متوجہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر خوشحال زیدی جنھوں نے بچوں کے ادب پر اچھے کام کئے ہیں وہ اپنی کتاب میں مختلف زبان وادب کی مثالیں اور تعریفیں کرنے کے بعد ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بچوں کے ادب میں پریوں اور جادو کی کہانیاں،نظمیں اور گیت، اخلاقی مضامین اسکول اور کھیل کا میدان اور سیر و سیاحت کی کہانیاں سب ہی کچھ ملتا ہے اور اسی کو بچوں کا ادب مانا گیا ہے،مگر اس بات کا قطعی فیصلہ نہ تو اساتذہ نہ ہی والدین، نہ ادیب اور شاعر ہی کر پاتے ہیں بچوں کا ادب ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس بات کا فیصلہ تو خود بچے ہی کر سکتے ہیں کہ ان کا ادب کیا ہو اور کیسا ہو؟ یہ کہنا بہت مشکل کہ بچے کس قسم کی کتب پسند کرتے ہیں؟ بچوں کا ادب کیا ہونا چاہئے۔''

(بچوں کا ادب اکیسویں صدی کی دہلیز پر ص:۱۹)

ادب خواہ کسی مزاج ومعیار کا ہو اس کی حتمی تعریف کر پانا مشکل ہوتا ہے۔بچوں کے ادب کے لیے یہ مشکل کچھ اور بڑھ جاتی ہے اس لیے کہ ہر ملک کی تاریخ،تہذیب، ثقافت، معاشرت قدرے مختلف ہوا کرتی ہے۔ بچے اپنے گھر، علاقہ اور ماحول میں پروان چڑھتے ہیں، اسی سے مانوس ہوتے ہیں،اسی زبان کو سمجھتے ہیں جو اردگرد بولی جاتی ہے۔ایک پرانی لوری کا یہ شعر دیکھئے:

چندا ماما دور کے
پوئے پکائے دور کے
آپ کھائیں تھالی میں
مُنّے کو دیں پیالی میں

اب اس میں چندا ماما یعنی چاند کو ماما یا ماموں سمجھنے کی ترغیب ہندوستان کی زمینی وانسانی تہذیب سے ماخوذ ہے۔جو صدیوں کی روایت کی امین ہے۔اسی طرح تھالی اور پیالی کی مانوس صورت اور الفاظ اور سب سے بڑھ کر لفظ مُنّا جس سے بچّہ از حد واقف اور مانوس ہے اور اس میں اپنے آپ کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔یہ وہ ساری کیفیتیں ہیں جو بچوں کو فطری انداز سے گرفت میں لے لیتی ہیں اور لاشعوری طور پر قطرہ قطرہ معنی کو اس کے نرم ونازک ذہن میں بساتی چلی جاتی ہیں۔مثالیں اور بھی ہیں،لیکن یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ بچوں کی ضرورت،ان کی خواہش،نفسیات کو سمجھنا ایک نازک امر ہے۔اکثر والدین بھی سمجھ نہیں پاتے چہ جائے کہ شاعر وادیب جن کے تخیل کی پرواز،فکر کی اڑان ادب کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے،لیکن بچوں کے ادب کی شرائط ہیں،اس کی حدیں ہیں،اس کی نزاکتیں ہیں،اس کی نزاکت،مشروطیت ہی اکثر فنکار کو پریشان کرتی ہے،لیکن یہی وہ منزل ہے جہاں سے بچوں کے ادب کی تخلیق ہوتی ہے،اکثر فنکار کو خود بچہ بننا پڑتا ہے۔وہی مزاج،وہی زبان اختیار کرنی پڑتی ہے جو بہر حال ایک مشکل کام ہے۔اس سے زیادہ مشکل کام ہے اس کا تجزیہ وتنقید کرنا۔غالباً یہی وجہ ہے کہ کم ازکم اردو شعر وادب میں بچوں کے ادب سے متعلق کم کتابیں ملتی ہیں۔

اب میں کچھ گفتگو اسمٰعیل میرٹھی (۱۹۱۷۔۱۸۴۴ء) پر کرنا چاہتا ہوں۔

میں یہاں ان کے سوانحی کوائف نہیں پیش کروں گا البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ زندگی کا جو دور انھوں نے پایا یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد کا دور۔اہل علم واقف ہیں کہ وہ ایک عبوری تھا جسے انگریزی میں ٹرانزسٹ پیریڈ کہتے ہیں۔ایسے میں میرٹھ کے رہنے والے سیدھے سادے سے اسمٰعیل میرٹھی روایتاً غزل گوئی کی طرف مائل ہوئے،لیکن حالی،آزاد وغیرہ کی کوششوں کے اثرات پھیل چکے تھے اور غزل کے مقابلے نظم گوئی کی ضرورت وافادیت سمجھی جانے لگی تھی۔غالباً یہی وجہ ہے کہ اسمٰعیل کی غزلوں میں بھی روایت پرستی کے باوجود ایک معصومیت تھی۔وہ غالب سے متاثر تھے۔چند اشعار اُس دور کے ملاحظہ کیجئے:

ذرہ ذرہ حیرتی ہے مہر پُر تنویر کا
ہے خودی آئینہ ہے ہنگامۂ تکبیر کا
عارض روشن پہ جب زلفیں پریشاں ہوگئیں
کفر کی گمراہیاں ہم رنگ ایماں ہوگئیں
دل گیا ہاتھ سے کیا ہاتھ سے داماں نکلا
کہ ترے پاؤں کی مانند گریباں نکلا

آپ کو ان اشعار میں غالب کا آہنگ بولتا نظر آئے گا، لیکن ساتھ ہی اسمٰعیل کا استادانہ رنگ بھی صاف جھلکتا ہے۔ کہیں کہیں تصوف کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ دو شعر دیکھئے:

وصل و فراق وہم سہی دل لگی تو ہے
پھر ہم کہاں جو پردۂ راز نہاں اٹھا
بزم ایجاد میں بے پردہ کوئی ساز نہیں
ہے یہ تری ہی صدا غیر کی آواز نہیں

ایک خیال ہے کہ بقول ڈاکٹر شاداب علیم آخری شعر سُن کر حالی پر وجد کی کیفیت طاری ہوگئی اور بار بار داد دیتے تھے اور شعر پڑھواتے تھے۔

اسمٰعیل میرٹھی سے متعلق بعض معتبر حوالوں سے ایک خیال یہ بھی آتا ہے کہ غزلوں میں وہ غالب اور مومن سے بطور خاص ضرور متاثر تھے، لیکن پس منظر سے حاصل کی گئی مذہبی و اخلاقی تعلیم اور بزرگوں کے درس ونتائج نے انھیں زندگی اور ادب کے تعلق سے ایک باعمل و با مقصد انسان بنا دیا تھا چنانچہ فکر وشعور کا یہ نازک اور انجان احساس اُنھیں حکمت، نصیحت اور تربیت کی طرف لے گیا اور انھوں نے غزلوں میں اس نوع کی بھی شاعری خلق کی جو ایہام، مشکل پسندی اور معیار بندی کے اُس دور میں ناپسند اور غیر معیاری قرار دی جا چکی تھی مثلاً اس نوع کے اشعار دیکھئے:

دوستی اور کسی غرض کے لیے
وہ تجارت ہے دوستی ہی نہیں
جس دل سے کدورت نہ گئی خاک ہے وہ دل
کیا آئینہ جو اہل صفا ہو نہیں سکتا
اگر آدمی کو نہ ہو مشغلہ کچھ
بہشت بریں میں ہو دشوار رہنا

اور یہ شعر تو سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے:

قارئین کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ اسمٰعیل میرٹھی تو بچوں کے شاعر ہیں پھر ان کی غزلوں پر کیوں بات ہو رہی ہے۔ تو اس سلسلے میں مجھے اس وقت پاکستان کے بزرگ نقاد جو خیر سے شاعر بھی ہیں سحر انصاری کا ایک قول یاد آرہا ہے جو انھوں نے عملاً مرثیہ گوئی کے لیے کہا تھا، لیکن وہ بات یہاں بھی مناسب لگتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جو ابتداء غزلیں کہہ لے وہی مرثیہ اور دیگر اصناف سخن پر طبع آزمائی کرنے کے لائق ہوتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ غزل گوئی دیگر اصناف سخن تک رسائی حاصل کرنے کی تربیت گاہ ہے۔ فراق گورکھپوری نے اپنے ایک طویل مضمون اردو غزل گوئی میں تہذیب شاعری اور تہذیب عاشقی کے تعلق سے اسی نوع کی کارآمد باتیں کی ہیں جس میں ان کا خیال ہے کہ ایک شاعر اگر ایک عمدہ غزل کہہ لیتا ہے تو پھر وہ کسی بھی صنف میں طبع آزمائی کر سکتا ہے۔ وہ اپنی نظم گوئی کو بھی غزل کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ غزل کو ہی اساس مانتے ہیں بظاہر یہ غیر ضروری سی گفتگو درمیان میں آگئی عرض مدعا یہ ہے کہ اگر اسمٰعیل عمدہ غزل کے شاعر نہ ہوتے اور شعر وسخن کی بہترین تربیت، مشق ومزاولت نہ ہوتی تو بچوں کی نرم ونازک اور حسّاس شاعری کے میدان میں ان کو غیر معمولی کامیابی نہ ملی ہوتی۔

اہل علم واقف ہیں کہ اسمٰعیل میرٹھی نے نظم کی ہیئت میں بھی تجربے کئے ہیں، لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر تفصیل سے لکھے جانے کی ضرورت ہے، لیکن یہاں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ مولانا نے جو عصر پایا اور جو معاصرین پائے (آزاد، حالی، شبلی وغیرہ) ان سب کی اجتماعی کوششوں سے نظم گوئی کا جو ماحول بنا ہوا تھا اور مولانا اسمٰعیل جس قدر سرسید کے حامی اور علی گڑھ تحریک کے اغراض ومقاصد کے ہم نوا تھے ان سبھی محرّکات نے ان کو روایتی غزل گوئی سے دامن چھڑا کر نظم گوئی کی طرف متوجہ کیا۔ حالی کی مختصر مثنویوں کا تو مولانا پر اس قدر اثر تھا کہ اسی رنگ میں کئی مثنویاں کہیں۔ مولانا ذکاءاللہ سے دوستی اور محمد حسین آزاد کی فرمائش پر انھوں نے تین مثنویاں انجمن لاہور کے لیے لکھیں اور بھیجیں۔ مکھیاں، چاند اور آب زلالہ کے عنوانات سے کہی گئی مثنویوں میں آخر الذکر مثنوی کی کافی تعریفیں ملتی ہیں۔ دو تین اشعار اس مثنوی کے ملاحظہ ہوں:

ہواؤں نے لگایا خوب پھندا
انوکھا ہے تری قدرت کا دھندا
نہیں مشکل اگر تیری رضا ہو
ہوا پانی ہو اور پانی ہوا ہو
مزاج اس کو دیا ہے نرم کیسا
جگہ جیسی ملے بن جائے ویسا

یہ مختصر مثنویاں دراصل نظمیں ہیں چونکہ ان کا تعلق فطرت سے زیادہ ہے اور یہ برکھارت کے طرز پر لکھی گئی ہیں اور ان کی ہیئت مثنوی کی ہے۔

اس لیے مولانا نے بھی ان کو مثنوی ہی کہا ہے۔ یوں تو مولانا نے متعدد مثنویاں کہیں، قصیدے کہے اور رباعیاں بھی، لیکن ان کا اصل میدان ورجحان نظم کی ہی طرف تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ نظیر کی وہ روایت جو کہیں دہلی کی استادانہ غزل گوئی کے سامنے دب سی گئی تھی، اسے انجمن پنجاب لاہور آزاد، حالی وغیرہ نے کچھ غیر شعوری، زیادہ شعوری طور پر زندہ کیا۔ انگریزی نظموں کے ترجموں نے ان شعرا کو شاعری کی مقصدیت اور افادیت پر ازسرنو سوچنے پر مجبور کیا۔ یہ سوچ اور رجحان جو ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا تھا اس تحریک میں جو لوگ نمایاں طور پر شریک تھے ان میں اسمٰعیل میرٹھی بھی برابر سے شامل تھے۔ حیات اسمٰعیل کے مصنف ڈاکٹر سیفی پریمی نے واضح طور پر لکھا ہے:

''اس دور کی بعض عظیم ادبی شخصیات کو انگریزی نظم کی خوبیاں محسوس ہوگئی تھیں اور انھوں نے ان خوبیوں کو ایک طرف اردو داں پبلک تک پھیلانا اور دوسری طرف اردو شعرا کو انگریزی انداز کی نظم نگاری کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اس ضمن میں یہ بھی ضروری بات ہے کہ ہندوستانی بچے کے ذہن کو انگریزی نظم کی خوبیوں سے متاثر کرنے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ اس نظم نگاری کی خوبیوں کے اظہار وابلاغ کا علاقہ خصوصی طور پر دہلی، میرٹھ، علی گڑھ، پانی پت وغیرہ کو سمجھنا چاہئے اور اس سلسلہ میں وہ اہم شخصیات جن کا تعلق ذہنی اور عملی طور پر نظم نگاری سے وابستہ رہا۔ مرزا غالب، سرسید، قلق میرٹھی اور محمد اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔'' (حیات اسمٰعیل، ص: ۱۴۸)

مولانا اسمٰعیل میرٹھی، سرسید سے کافی متاثر تھے اور سرسید کی حمایت میں کئی مضامین اور قطعات معارف میں لکھ چکے تھے۔ سرسید کا سارا زور اولاً تعلیم کی طرف تھا روشن خیالی اور عقل پرستی کے ساتھ۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی معلم ومدرس تھے، شعبۂ تعلیم سے وابستہ تھے اور ذہن میں اصلاح وتربیت کا جذبہ رکھتے تھے۔ اہل علم واقف ہیں کہ سرسید وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے عمدہ وترقی یافتہ تعلیم کے لیے خود بچوں کی کتابیں تیار کیں۔ محمد حسین آزاد نے بھی کچھ اس نوعیت کے کام کئے۔ اسمٰعیل میرٹھی نے کچھ تو ان حضرات سے اثرات قبول کئے۔ کچھ ملازمت کی ذمہ داریوں کے تحت اور زیادہ اپنی ذات اور صفات کے حوالے سے بچوں کے لیے متعدد کتابیں، قاعدے اور نصاب تیار کئے۔ یہ ایک غیر معمولی کام تھا جو اس وقت کے نونہالوں کے لیے ضروری سمجھا گیا۔ مولانا کے ہم عصروں میں نذیر احمد، عبدالحلیم شرر وغیرہ کے ناول خوب مقبول ہو رہے تھے چنانچہ ان اثرات اور ضروریات کے تحت مولانا نے بھی بچوں کے لیے کچھ کہانیاں لکھیں، ترجمے بھی کئے، لیکن وہ بنیادی طور پر شاعر تھے اس لیے رفتہ رفتہ وہ روایتی قسم کی غزلوں، قصیدوں اور مثنویوں سے بھی دامن چھڑا کر بچوں کے لیے نظمیں کہنے لگے۔ خود مولانا کو بچّوں کی معصومیت، نقل وحرکت اور شرارتیں بیحد پسند تھیں جس کا اظہار انھوں نے اپنے کئی خطوں اور نثر کی تحریروں میں کیا ہے۔ نیز فطرت اور موسم سے بھی ان کا لگاؤ فطری تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ نظیر اور حالی کی عام فہم نظمیں خواص اور عوام میں خوب مقبول ہو رہی تھیں اور پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ شاعری میں محبوب ومعشوق کی جگہ پر ماں بہن بیٹی مخاطب کی جا رہی تھیں۔ حالی کا یہ شعر غیر معمولی طور پر شہرت پا رہا تھا:

اے ماؤ! بہنو! بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہی قوموں کی عزت تم سے ہے

ان سب کے فطری اور مقصدی امتزاج نے تخلیقی انجذاب کی وہ شکل اختیار کر لی جس نے آگے بڑھ کر پہلے رومان پھر وجدان اور اس کے بعد ایک دبستان کی شکل اختیار کر لی۔

کل پورے طور پر اور آج ادھورے انداز میں سہی اردو زبان جس جس گھر میں ذرا سی بھی پڑھی لکھی گئی اس گھر کے آنگن میں، کمرے اور دالان میں اسمٰعیل میرٹھی کے یہ مصرعے محاورے بن کر گونجتے رہے:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی
نہر پر چل رہی پن چکّی
دھن کی پوری ہے کام کی پکّی
علم سیکھ سبق پڑھو بچو
اور آگے چلو بڑھو بچو

اس طرح کے اور بھی اشعار ہمارے حافظے میں آج بھی موجود ہیں، لیکن ہم نے ایسی شاعری اور ایسے شاعر پر سنجیدگی سے توجہ نہ دی اور بچکانی شاعری سمجھ کر آگے بڑھ گئے، لیکن یہ بھول گئے کہ اس نوع کی شاعری کا فن الگ ہے، فکر الگ ہے اور اس کی خاندانی انسانی اور سماجی افادیت ومقصدیت بھی الگ ہے۔ اس کی سماجیات اور شعریات ہی الگ ہے، لیکن ہم نے ان امور پر سنجیدگی سے گفتگو نہیں کی۔ پن چکّی ہو یا گائے یا اسلم کی بلّی۔ ان میں جو اجتماعیت ہے اور اس اجتماعیت کے بطن سے کیفیت اور مقصدیت کا درس ہے اسے بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ باتوں باتوں کے ذریعے قصّہ کہانی کے ذریعے فرض۔ محنت اور ضرورت کے جو عناصر پوشیدہ ہیں بچے بڑی آسانی سے سمجھ لیتے ہیں اور لاشعور میں قطرہ قطرہ ایک ایسا

انسانی واخلاقی تصور جذب ہوتا جاتا ہے جو بڑوں میں ممکن نہیں۔اس لیے کہ معصوم ذہن کومل ،نرم اور سادہ ہوتا ہے جو بڑی آسانی سے سیکھ اور سمجھ لیتا ہے۔گائے نظم کو ملاحظہ کیجئے۔اس کے یہ دو شعر بطور خاص دیکھئے:

خاک کو اس نے سبزہ بنایا
سبزہ کو پھر گائے نے کھایا
کل جو گھاس چری تھی بن میں
دودھ بنی اب گائے کے تھن میں

ان دو اشعار میں فطرت اور اس کے پروسس پر جو اشارے ہیں وہ قابل غور ہیں، یہی نہیں وہ جس طرح اپنے بچھڑے کو چاٹتی ہے اور وہی بچھڑا بیل بن کر کھیتی میں کام آتا ہے۔یہ سب کچھ اس نظم میں بڑے سلیقے سے آ گیا ہے یعنی کام کرنا زندگی میں بہت ضروری ہے یہی نظم کا نچوڑ بن جاتا ہے۔

اس طرح ایک چھوٹی سی نظم ایک مور اور کلنگ میں جب کلنگ مور سے کہتا ہے:

آؤ کریں آسماں کا پھیرا
کچھ دم ہے تو ساتھ دو نہ میرا
منھ اپنا سا لے کے رہ گیا مور
تھا اس میں کہاں اُڑان کا زور
بھاتا ہے جنھیں نرا دکھاوا
وہ لوگ ہیں مور کے بھی باوا
بس ان کو ہے ٹیپ ٹاپ کی دھن
شبنمی کے سوا نہیں کوئی گن
دیکھیں کسے یاد ہے زبانی
مور اور کلنگ کی کہانی

شاعری میں کہانی کہنا یا کہانی میں شاعری کرنا اور وہ بھی بچوں کے لیے بیحد مشکل فن ہے۔اس میں صرف زبان و بیان کی نزاکت کا ہی معاملہ نہیں ہوتا بلکہ بچوں کی معصومیت، ان کی نرم نفسیاتی کیفیت کا خیال بھی ناگریز ہوتا ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔اسمٰعیل چونکہ بچوں کے استاد تھے اور بچوں سے غیر معمولی محبت کرتے تھے اور اس سے زیادہ یہ کہ ان کے سامنے ایک مشن تھا۔انھیں یہ بھی احساس تھا کہ بچے چرند پرند کھیل کود، تصویروں وغیرہ میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔اور ان اشیا سے تو ان کی دلچسپی غیر معمولی حد تک بڑھ جاتی ہے۔جو غالباً اسی لیے غیر جاندار ہوتے ہیں اور شاعر اُنھیں جاندار شے کی طرح پیش کرتا ہے۔ایک کردار بنا کر اور پھر ایک قصّہ، واقعہ اور اسی کے بطن سے ایک صحت مند نتیجہ۔ان کی ایک نظم ہے ایک پودا اور گھاس۔شاعر نے دونوں کو کردار بنا کر، کیا خوبصورت انداز میں بات شروع کی:

اتفاقاً ایک پودا اور ایک گھاس
باغ میں دونوں کھڑے ہیں پاس پاس
گھاس کہتی ہے اے میرے رفیق
کیا انوکھا اس جہاں کا ہے طریق
ہے ہماری اور تمھاری ایک ذات
ایک قدرت سے ہے دونوں کی حیات
مٹی، اور پانی ہوا اور روشنی
واسطے دونوں کے یکساں ہے بنی
تجھ پہ لیکن ہے عنایت کی نظر
پھینک دیتے مجھے جڑ کھود کر

اب پیڑ کا جواب سنیے:

اُس سے پودے نے کہا یوں سر ہلا
گھاس! سب بیجا ہے یہ تیرا گِلا
مجھ میں اور تجھ میں نہیں کچھ بھی تمیز
صرف سایہ اور میوہ ہے عزیز
فائدہ ایک روز مجھ سے پائیں گے
سایے میں بیٹھیں گے اور پھل کھائیں گے
ہے یہاں عزت کا سہرا اس کے سر
جس سے پہنچے نفع سب کو بیشتر

آخری شعر نظم کا نچوڑ ہے جسے بچہ کہانی کے حوالے سے بڑے مزے سے سمجھ لیتا ہے اور قطرہ قطرہ اس کے ذہن نازک کا حصّہ بنتا جاتا ہے۔اسی طرح ایک جگنو اور بچّے کی باتیں۔کتا اور اس کی پرچھائیں ایک گھوڑا اور اس کا سایہ وغیرہ کے آخری شعر کو دیکھئے:

نہ الّو ٹھ پنے سے کرو پائمال
سنبھل کر چلو آدمی کی سی چال
اپنے دُکھ کا کیجئے اوّل علاج
دوسروں کا پوچھئے پیچھے مزاج
تم ہوس میں سڑی نہ بن جاؤ
جو ملے اس کو کام میں لاؤ
جھوٹ کی بھول کر نہ ڈالو خو
جھوٹ ذلت کی بات ہے اَخ تھو

اَخ تھو بھدّا لفظ ہے، لیکن شاعر نے جس تخلیقی پیرایے میں استعمال کیا اس سے جھوٹ کے تئیں نفرت جاگتی ہے۔ اسمٰعیل کی ایک اور غیر معمولی نظم ہے مُلمع کی انگوٹھی۔ نظم کے چند اشعار اور آخری شعر دیکھئے:

چاندی کی انگوٹھی پہ جو سونے کا چڑھا جھول
اوچھی تھی لگی بولنے اِترا کے بڑا بول
چاندی کی انگوٹھی کے نہ میں ساتھ رہوں گی
وہ اور ہے میں اور یہ ذلّت نہ سہوں گی
میں قوم کی اونچی ہوں بڑا میرا گھرانہ
وہ ذات کی گھٹیا ہے نہیں اس کا ٹھکانہ
میری سی چمک اس میں نہ میری سی دمک ہے
چاندی ہے کہ ہے رانگ مجھے اس میں بھی شک ہے
کھوٹے کو کھرا بن کے نکھرنا نہیں اچھا
چھوٹے کو بڑا بن کے اُبھرنا نہیں اچّھا

کیا بے مثال نظم ہے۔ دو غیر جاندار کرداروں کے مابین مکالماتی نظم ضرور ہے، لیکن ان مکالموں میں جو چھل بل اور رنگ اور آہنگ ہے اُس نے صوتی اعتبار سے تو گرفت میں لیا ہی، لیکن بعد کے اشعار میں اصل اور نقل، سانچ کو آنچ وغیرہ کے ذریعہ زندگی کے حقیقی و سچی اقدار کی جو نشاندہی کی گئی ہے وہ صرف بچوں کے لیے ہی نہیں بڑوں کے لیے بھی کیا مفید اور کارآمد ہے اور آخری شعر:

کھوٹے کو کھرا بن کے نکھرنا نہیں اچھا
چھوٹے کو بڑا بن کے اُبھرنا نہیں اچھا

سنہرے حروف میں لکھی جانے والی نصیحت اور ہدایت ہے یہاں مولانا نے سادگی میں بڑے فلسفہ کی بات کہہ دی۔ اسی طرح دال اور چپاتی کا مکالمہ۔ ایک جگنو اور بچے کی باتیں۔ وغیرہ میں حیات و کائنات، روشنی اور اندھیرا۔ سچ اور جھوٹ۔ محنت اور تساہلی وغیرہ کے ایسے اسباق اور افکار ہیں جو اردو کی بڑی بڑی نظموں میں نہیں ملتے، لیکن ہم نے انھیں بچوں کی آسان اور معمولی شاعری سمجھ کر ادب و تنقید میں وہ مقام نہیں دیا جس کی کہ یہ مستحق ہیں۔ میں ''ملمّع کی انگوٹھی'' کو اردو کی چند عمدہ نظموں میں تصور کرتا ہوں، جو اُس خاص دور میں کہی گئی اور خواص و عوام میں مقبول ہوئی۔ یہ بظاہر لڑکیوں کے لیے کہی گئی ہے، لیکن مردوں کے لیے بھی اتنی ہی افادی اور مقصدی ہے۔

فطرت سے انسان کا لگاؤ فطری ہے۔ شاعروں کے یہاں یہ فطرت مختلف رنگ و آہنگ کے ساتھ جلوہ گر ہوئی ہے کثیر سرمایہ ہے، مگر بغور ملاحظہ کیجئے تو کسی نے محض ترکشی کر دی۔ کسی نے نیچرل انداز میں سچی کیفیت پیدا کر دی تو کسی نے فطرت اور فلسفہ کو ہم آہنگ کر کے اس کا رشتہ حیات و کائنات سے جوڑ دیا۔ اسمٰعیل میرٹھی نے فطرت، موسم، شام، رات، شفق، اُفق غرض کہ سبھی موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن ان کا انداز و اسلوب دیگر شاعروں سے مختلف و منفرد ہے۔ یہ اختلاف و انفرادیت کیا ہے اس پر طویل گفتگو کی جا سکتی ہے، لیکن یہاں صرف چند اشارے ہی پیش کروں گا۔ بارش کا پہلا قطرہ اسمٰعیل کا بے حد مشہور نظم ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرہ کے دل میں یہ تھا خطرہ
ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس
اپنا ہی کروں گا ستیا ناس
آتی ہے برسنے سے مجھے شرم
مِٹّی پتھر تمام ہیں گرم

نظم میں قطرہ کی بساط اور اس کے کمزور احساس کو ایک خاص معنوی انداز میں پیش کیا گیا کہ بات قطرہ تک محدود نہیں رہ جاتی بلکہ کمزور و نادار انسانوں تک پہنچتی ہے۔ ایک لطیف و معصوم احساس کے ساتھ نظم کے اشعار دل پر اترتے چلے جاتے ہیں، پھر اس بے مثال شعر کے ذریعہ نظم کروٹ لیتی ہے:

کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی
کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی

گھٹا میں کھچڑی کا پکنا اور کچھ کچھ بجلی کا چمکنا منظر نگاری نہیں بلکہ حقیقت نگاری کی وہ منزل ہے جہاں منظر تمثیل کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور کچے پکے خیالات کی کشمکش تخلیقی وحدت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے فوراً بعد ایک بہادر قطرہ کی دلیری سامنے آتی ہے وہ کمزور قطروں کو للکارتا ہے:

بولا للکار کر کہ آؤ
میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گزرو جو ہو سکے کچھ احسان
ڈالو مردہ زمین میں جان
یارو یہ ہچر مچر کہاں تک
اپنی سی کرو بنے جہاں تک

اور پھر اس طرح اُس کے پیچھے ایک کے بعد ایک کمزور قطروں کا

سلسلہ بن گیا اور سوکھا جنگل دیکھتے دیکھتے ہرا ہو گیا اور زمین سرسبز و شاداب ہوگئی اور نظم اس خوبصورت، بامعنی و بامقصد پیغام پر ختم ہوتی ہے:

اے صاحبو! قوم کی خبر لو
قطروں کا سا اتفاق کرلو
قطروں ہی سے ہوگی نہر جاری
چل نکلیں گی کشتیاں تمھاری

کیا آپ کو یہ نظم صرف فطرت اور موسم سے ہی متعلق نظر آتی ہے یا اس میں سرسید کی وہ انفرادی کوششیں بھی نظر آتی ہیں جو ایک قطرہ کے طور پر یکے بعد دیگرے ان کے رفقاء ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ میرٹھ ہی کی ڈاکٹر شاداب علیم جنھوں نے اسمٰعیل میرٹھی پر عمدہ مقالہ لکھا ہے۔ اس نظم کے تعلق سے لکھتی ہیں:

''ہر تحریک کا آغاز فرد واحد سے ہوتا ہے۔ حالات جب حد سے گزر جاتے ہیں تو ایک شخص کھڑا ہوتا ہے اور اپنی جرأت کے باعث قوم کا رہنما بنتا ہے اور پھر لوگ ساتھ آتے ہیں اور کارواں بن جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی اور سرسیّد اس کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔'' (ص:۲۶۶)

دیکھئے نظم دائرۂ فطرت سے نکل کر سماجی حقیقت سے رشتہ استوار کرلیتی ہے۔ ایسی شاعری کو صرف نیچر شاعری کہہ پانا مشکل ہے۔ اسمٰعیل کی ایک نظم ہے رات۔ اسے آپ فطرت سے جوڑیں یا نظام حقیقت سے۔ آغاز کچھ اور کہتا ہے:

گیا دن ہوئی شام آئی ہے رات
خدا نے عجب شے بنائی ہے رات
نہ ہورات تو دن کی پہچان کیا
اُٹھائے مزہ دن کا انسان کیا

اگر یہ نظم صرف رات کے منظر تک محدود رہتی تو اس میں تاریکی و تنہائی کا ذکر ضرور ملتا ہے اور احساس خوف بھی، لیکن دن سے رشتہ جوڑ کر شاعر نے ایک فطری نظام اور روشن قدر کی اہمیت پر زور دیا ہے اور آخر میں تو نظم ایک اور سمت چلی جاتی ہے جہاں طبقات اور کمزور طبقہ کی فطرت اُجاگر ہوتی ہے اور رات دن کے اُجالے میں آکر ایک بڑا روپ اختیار کرلیتی ہے۔ یہ اشعار دیکھئے:

غریب آدمی جو کہ مزدور ہیں
مشقّت سے جن کے بدن چور ہیں
وہ دن بھر کی محنت کے مارے ہوئے
وہ ماندے تھکے اور ہارے ہوئے
نہایت خوشی سے گئے اپنے گھر
ہوئے بال بچّے بھی خوش دیکھ کر

اسی طرح سے گرمی کا موسم میں بھی امیری اور غریبی کے فرق کو اس طرح پیش کیا:

نہ پوچھو کچھ غریبوں کے مکاں کی
زمیں کا فرش ہے چھت آسماں کی
نہ پنکھا ہے نہ ٹٹّی ہے نہ کمرہ
ذرا سی جھونپڑی محنت کا ثمرہ
امیروں کو مبارک ہو حویلی
غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

اسی طرح شفق، برسات، ہمالہ، قوس قزح وغیرہ بھی اسی نوع کی نظمیں ہیں جن میں صرف فطرت نہیں ہے بلکہ زندگی کی حقیقت ہے پیچیدہ حقیقت جسے مولانا کی شاعری پوری سادگی اور تاثیر کے ساتھ پیش کرتی چلی جاتی ہے۔ ایک نظم ہے جاڑہ اور گرمی۔ یہ بھی ان کی دوسری نظموں کی طرح مکالمات پر مبنی ہے۔ جاڑے کی برتری ہے۔ شیخی ہے۔ جس کو سُن کر گرمی بھی جل کر جواب دینے لگتی ہے۔ گرمی کے پہلے ہی مصرع کو دیکھئے:

آپ اپنے منھ میاں مٹھو نہ بن
خود ستائی عیب ہے او خود ستا
اس کو ہوتا ہی نہیں حاصل کمال
جو کہ اپنے آپ کو سمجھے بڑا
با ہنر تو سر کشی کرتے نہیں
بلکہ سر کو اور دیتے ہیں جھکا

اور پھر گرمی اپنے اوصاف بیان کرتی ہے اور نظم ان اشعار پر ختم ہوتی ہے:

کچھ نہیں ہے اس میں جاڑے کا قصور
کچھ نہیں اس میں گرمی کی خطا
جب حقیقت پر نہیں ہوتی نظر
یوں ہی رہتا ہے بہم شکوہ گلا
ہے حرارت کی کمی بیشی فقط
ورنہ جاڑا کون؟ اور گرمی ہے کیا؟

غرض کہ فطرت سے متعلق ان کی ایسی نظمیں نہیں ہیں یا بے حد کم ہیں جن میں صرف فطرت کی عکاسی کی گئی ہو اس نوع کی تقریباً تمام نظموں ہی فطرتِ انسانی اور اخلاق اور اقدار کی باتوں کی کثرت ہے جو ان کی تخلیقی

وحدت کا طُرہَ امتیاز ہے اور اگر ان کے اخلاق، پندونصائح، حقیقت ومعرفت کو پرکھنا ہے تو ان نظموں کو دیکھیے جو راست طور پر ایسے موضوعات کو چھوتی ہیں مثلاً چھوٹے کام کا بڑا نتیجہ۔ایک قانع مفلس، ترک تکبیر، ناقدر دانی، شمع ہستی، غصّہ کا ضبط، انسان کی خام خیال، مثنوی بامراد، حیا، مکالمہ سیف وقلم۔وغیرہ بے شمار نظمیں ہیں۔مثنویاں ہیں، رباعیاں ہیں، قطعات ہیں، قصائد ہیں، قومی نظمیں ہیں، تہواروں سے متعلق نظمیں ہیں۔غرض کہ ایک دنیا آباد ہے۔وہ دنیا جو کبھی نظیر اکبرآبادی نے دبستان دلی کی غزل گوئی سے بہت دور اکبرآباد میں بسائی تھی اور جسے سوقیانہ شاعری سمجھ کر منھ نہیں لگایا گیا، لیکن آج وہی دنیا عوامی شاعری وزمینی شاعری کی آبرو بن گئی ہے۔الطاف حسین حالی جو غالب کے شاگرد تھے اور ان کے صحبت یافتہ بھی یادگار غالب جیسی بے مثال کتاب ضرور لکھتے ہیں، لیکن اپنے مقدمہ میں غزل گوئی کی مخالفت کرتے ہیں اور برکھارُت جیسی نظمیں کہتے ہیں۔اگر نظیر نے برسات کی بہاریں جیسی غیر معمولی نظم نہ کہی ہوتی تو شاید برکھارت کا وجود بھی نہ ہوتا۔نظیر پر ہی مضمون لکھتے ہوئے مجنوں گورکھپوری نے اچھی بات کہی ہے کہ اگر نظیر نے برسات کی بہاریں۔ ریچھ کا بچہ جیسی نظمیں نہ کہی ہوتیں تو حالی کی برکھارت، چپ کی داد، مناجات بیوہ جیسی نظموں کے وجود میں آنے میں دیر لگ جاتی۔اسمٰعیل میرٹھی کے سامنے تو یہ دونوں زندہ مثالیں تھیں۔ساتھ ہی ایک تحریک تھی ترقی یافتہ رجحان تھا اور ایک مشن بھی چنانچہ اسمٰعیل میرٹھی نے ان تمام رجحانات، افکاروخیالات کے امتزاج وانجذاب سے ایک ایسی شاعری کی دنیا آباد کی جہاں نظیر بھی جھانکتے نظر آتے ہیں اور حالی بھی شانہ بشانہ کھڑے ہیں اور رہنما سرسید تو ہیں ہی۔
عجیب بات ہے کہ اتنا دامن وسیع ہوتے ہوئے بھی اسمٰعیل میرٹھی بچوں کے شاعر کے طور پر زیادہ جانے گئے اور واقعتاً وہ بچوں کے بہت اچھے کامیاب اور پُر اثر شاعر تو ہیں ہی، لیکن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔اس ''علاوہ'' پر بھی غور کرنے اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔پروفیسر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے:

''سرسید تحریک نے عقلیت پسندی اور ذہنی بیداری کی جو فضا پیدا کی تھی اُس میں بڑوں کی باتیں، بڑوں کے لہجے میں کرنے والے تو بہت تھے بچوں کے لہجہ میں سامنے کی باتیں کرنے والا کوئی نہ تھا۔''

پروفیسر نارنگ یہ بھی کہتے ہیں:

''بچوں کا ادب اسمٰعیل میرٹھی کی ادبی شخصیت کا محض ایک رُخ ہے۔ان کا شمار جدید نظم کے ہیئتی تجربوں کے بنیادگزاروں میں بھی ہونا چاہیے.....آزاد اور حالی نے جدید نظم کے لیے زیادہ تر مثنوی اور مسدس کے فارم کو برتا تھا۔اسمٰعیل نے ان کے علاوہ مثلّث، مُربع، مخمّس اور مثمن سے بھی کام لیا۔انھوں بے قافیہ نظمیں بھی لکھی ہیں اور ایسی نظمیں بھی جن میں مُروّجہ بحروں کے اوزان کو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے مصرعے ترتیب دے گئے ہیں۔ بعد میں حلقۂ ارباب ذوق کے شاعروں اور ترقی پسند شاعروں نے آزاد نظم اور نظم معریٰ کے جو تجربے کئے ان سے بہت پہلے عبد الحلیم شرر، نظم طباطبائی اور نادر کاکوری اور اُن سے بھی پہلے اسمٰعیل میرٹھی ان راہوں سے کانٹے نکال چکے تھے۔''

(دیباچہ حیاتِ اسمٰعیل)

میر، غالب، اقبال یقیناً ہماری اردو شاعری کی عزّت، عظمت اور آبرو ہیں، لیکن شاعری اور زندگی کے تمام ابعاد اور جہات انہی پر تو ختم نہیں۔ زندگی کے اور بھی رُخ ہیں اور بھی شعبے اور بھی تقاضے جن پر دیگر شاعروں نے خونِ جگر صرف کیا، عرق ریزی کی، اپنا ایک مخصوص رنگ جمایا اور منفرد پہچان بنائی۔زندگی بدل چکی ہے۔ادب بھی بدل چکا ہے۔اس کے تقاضے اور پیمانے بھی بدل چکے ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ ہم نظیر اکبرآبادی جیسے انوکھے عوامی شاعر اکبرالٰہ آبادی جیسے طنز ومزاح کے نُکیلے شاعر۔چکبست جیسے سجیلے قومی شاعر اور اسمٰعیل میرٹھی جیسے البیلے بچوں کے شاعر کو نئے سرے سے پہچانیں اور ان کی حقیقی خدمات کا معروضی جائزہ لیں، تعین قدر کریں اور ان کو وہ مقام دیں جو ہماری معیار پرست تہذیب وتنقید نے نہیں دیا۔
یہ بات شاید غلط نہ ہو کہ اگر نظیر، حالی، اکبر، اسمٰعیل جیسے رنگا رنگ شاعر نہ ہوتے تو اقبال کو بھی عظیم اقبال بننے میں دیر لگ سکتی تھی۔اسی طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ نظیر، حالی وغیرہ نہ ہوتے تو شاید محمد اسمٰعیل کو بھی اسمٰعیل میرٹھی بننے میں دیر لگ سکتی تھی۔یہ کوئی ایسی غلط بات نہیں چراغ سے چراغ جلتے ہیں، لیکن بچوں کی شاعری کے تعلق سے اسمٰعیل میرٹھی کا چراغ اس قدر تابناک اور روشن تر ہے کہ ابد تک تاریخ ادب میں جگمگاتا رہے گا۔تبھی تو حیات اسمٰعیل کے مصنف ڈاکٹر سیفی پریمی اپنی کتاب کا خاتمہ ان جملوں پر کرتے ہیں اور انہی جملوں پر میں بھی اپنی گفتگو تمام کرتا ہوں:

''مولانا اسماعیل میرٹھی ہمارے مایۂ ناز مشاہیر میں ہیں جن کی ادبی خدمات نے اپنے دور کے مذاق ومزاح کو بدلنے میں ایک تاریخی خدمت انجام دی ہے۔ان کی شاعرانہ ونثری خدمات کا اعتراف ہماری ادبی تاریخ کا ایک ناگزیر فریضہ ہے۔''

◆◆◆